منڈی

لاہور ..... انارکلی کی پہیلیوں جیسی گلیاں ہوں یا پرانی انارکلی کی دودھ جلیبی، گلبرگ مارکیٹ کا وی آئی پی کلچر ہو یا شاہ عالمی کی قلفی، پاکستان کی پہچان، مینارِ پاکستان کی بلندیاں ہوں یا شاہی قلعے کی بلند و بالا فصیلیں، بادشاہی مسجد کی محرابیں ہوں یا داتا صاحب کی سبیلیں، اس شہر میں سب ملتا ہے۔ ان پر ہجوم بازاروں اور سرسبز باغات کے ساتھ ساتھ لاہور اپنی منڈیوں کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے، جیسے غلہ منڈی، سبزی منڈی، مچھلی منڈی، مویشی منڈی اور ہیرا منڈی۔

محبت کی معراج کب کاروبار بن گئی کچھ پتا نہیں۔ یہ دوزخ کی سبیل کب سے یہاں برباد ہے، اس کا بھی کچھ علم نہیں۔ ہاں کم از کم مغلوں کے وقت سے تو ہے۔ بربادی کی اتنی مضبوط آبادکاری کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے کرتا دھرتا اپنے بچوں کو تہذیب سکھانے کے لیے طوائفوں کے پاس بھیجتے تھے۔ وہ کچھ ایسے تعلیم یافتہ ہوئے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں شعر پڑھتے روپوش ہو گئے۔ کبوتر تک تو ٹھیک تھا، ایک عظیم سلطنت ہی گنوا بیٹھے۔

ہمارا اَدب اس وحشت نگری کی اندوہناک داستانوں سے اٹا پڑا ہے۔ شاعر ہوں یا ادیب سب ہی اس منڈی کے باسیوں کی سلگتی زندگی کا عرق بیچتے رہے، یا پیتے رہے۔ منٹو تو کچھ اتنا سچ بول گئے کہ منڈی جانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جب اس شہرِ خراباں کے باسیوں کی بربادی کے قصے ہمارا اَدب بن گئے تو قوم کا کیا بننا تھا۔ انگریز آ گئے۔ ان کا اس گورکھ دھندے سے کیا لینا دینا تھا، بس ٹیکس دیئے جاؤ اور لگے رہو۔ کچھ اور وقت گزرا تو لاکھوں فرزندانِ توحید، اسلام کے نام پر مینارِ پاکستان کے مقام پر اکٹھے ہوئے اور قراردادِ پاکستان منظور کی۔ جب کہا کہ اس ملکِ خداداد کو اسلام کے ذریں اصولوں پر قائم کریں گے تو ساتھ ہی خاموش بیٹھی ہیرا منڈی نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ ماردی۔ پاکستان بن گیا۔ قائداعظم چلے گئے۔ مارشل لا آ گیا۔ پھر جمہوریت آ گئی پھر مارشل لا آ گیا۔ سرِعام پھانسیاں ہوئیں، کوڑے مارے گئے، ستر ہزار بانکے نوجوان دین کے نام پر کٹ مرے لیکن ہیرا منڈی وہیں رہی۔ حکومتیں آئیں چلی گئیں، ایک کے بعد ایک چیف جسٹس بدلا لیکن کسی کو نظر نہیں آیا کہ بادشاہی مسجد کے منبر کے سائے میں عزتوں کا کاروبار ہو رہا ہے۔ جہاں اذان اور تلاوتِ قرآن پاک ہوتی ہے، عین اس کے عقب میں انسان کی بیٹی جانوروں سے بھی بدتر طریقے سے بکتی ہے، برباد ہوتی ہے۔ اس عظیم الشان مسجد میں جمعہ پڑھنے والے مومن کس بے دردی سے اپنی نیکی کی حقیر پوٹلیوں کو ان تھرکتے پیروں میں روندتے ہیں، کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ اَب تو ریاستِ مدینہ بھی بن گئی لیکن لاہور شہر کا یہ گرہن نہ تو رویت ہلال کمیٹی کو نظر آیا اور نہ ہی وزارتِ سائنس و

ٹیکنالوجی کو۔

اس مقامِ ذلت کی دوسری طرف کب سے داتا گنج بخش کا مزار آباد ہے۔ ذائرین اور متعقدین جوک در جوک آتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، دیگیں بٹتی ہیں، دھمال پڑتی ہے، دودھ نچھاور ہوتا ہے، لیکن کسی صاحبِ ایمان کو سڑک کے دوسرے سرے پر عصمت دری نظر نہیں آتی۔

منڈی ہے۔ یہاں کچھ تو بکتا ہے۔ جب کچھ بکتا ہے تو اس کی ترسیل کا نظام بھی ہوتا ہے۔ طلب زیادہ ہو تو رسد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور کاروبار صدیوں پر پھیلا ہو اور منافع بخش بھی ہو تو بہت سی ذیلی منڈیاں بن جاتی ہیں۔ سادہ سا معاشی اصول ہے، نہ جانے لوگوں کو کیوں سمجھ نہیں آتا کہ اس منڈی میں بکنے والا مال کہاں سے آتا ہے۔ آسمان سے، بیرون ملک سے، یا..... آئیدن نیا قانون لاتے ہیں، ریلیاں نکالی جاتی ہیں، دھواں دار تقریریں شعلے اگلتی ہیں لیکن ذینب کو برباد ہونے سے کوئی نہیں بچاتا۔ اغوا کی بڑھتی وارداتوں کا واویلا کرتے ہیں لیکن ان اغوا شدگان کے Showroom کی طرف نگاہ نہیں ڈالتے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ ان عقل کے اندھوں کو لاہور کی ہیرا منڈی نظر نہیں آتی تو Dark Web کی عالمی منڈی کیا نظر آئے گی۔ خیر، ہمیں اس سب سے کیا لینا دینا۔ ہمیں تو اپنا قصہ سنانا ہے۔

اسی لاہور شہر کے بہت سے کالجوں میں سے ایک کالج کے ہاسٹل میں میں بھی

مقیم تھا، اور اس ہیرا منڈی کے ہزاروں گاہکوں میں سے ایک گاہک میرا Roommate تھا۔ دو میز، دو کرسیاں اور دو دیوار میں جڑی الماریاں، یہی ہماری کُل کائنات تھی۔ میرا بستر اور میز کرسی سڑک کی جانب کھڑکی کے ساتھ تھے اور اس کا سامان دروازے کے قریب۔ بیچ میں کچھ جگہ خالی تھی، جہاں ہم نے دری بچھا کر دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہاسٹل میں کوئی تین سو کمرے ہوں گے اور پانچ سو رہائش پذیر۔ ان جوانوں کی صحت بحال رکھنے کے لیے ایک Mess اور ایک جوس کی دکان بھی تھی۔ بائیں طرف غسل خانوں کی قطاریں تھیں اور ان کے سامنے باسکٹ بال کا کورٹ جہاں Flood Light میں کرکٹ کا میچ روزانہ ہوتا تھا۔

میرا Room mate محسن اچھا لڑکا تھا۔ کسی کھاتے پیتے خاندان سے ہو گا۔ ان دنوں تعلیم کے نام پر لاہور میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ آپ کہیں گے کہ اس کے اپنے اعمال اور تمہارے اپنے، تمہیں اس سے کیا لینا دینا۔ بالکل درست۔ اگر وہ اپنے اعمال اپنے تک ہی محدود رکھتا تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن اپنی ہر ہیرا منڈی کی واردات کے بعد وہ مجھے اس کا قصہ مصالحے ڈال کر سناتا تو میرے لیے ایمان سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتا۔ سو خود کو محظوظ کرنے کے لیے وہ ہر روز کوئی سچا جھوٹا قصہ گھڑ لیتا اور پھر یا تو مجھے کمرے سے جانا پڑتا یا ہم دونوں میں ان بن ہو جاتی۔ پانی کا اگر ایک قطرہ بھی لگاتار پتھر پر گرتا رہے تو بالآخر آر پار ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی آہستہ آہستہ اس کی باتوں میں دلچسپی ہونے

لگی۔ جوانی کا قصور کہیں یا نادانی کا، ذہن کے دروازے پر ابلیس نے دستک دینی شروع کر دی۔ عجیب سے سوال ذہن میں آتے تھے: 'کیا ساری پابندیاں میرے لیے ہی ہیں؟'۔ 'کیا بس میں ہی رہ گیا ہوں نیکی کے لیے؟'۔ وغیرہ وغیرہ۔

پہلے پہلے تو اس خیال سے کہ اگر ابا جی کو پتا چل گیا تو خیر نہیں یا یہ کہ اگر گاؤں کے کسی پنچھی نے مجھے ہیرا منڈی میں دیکھ لیا تو پھر جہنم میں بھی جگہ نہیں ملے گی، تمام ارادے دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ڈر ذائل ہونے لگے۔ ماں کی دعائیں اور تربیت پیروں کی بیڑیاں ٹھہریں تو باپ کا عزت و ناموس سے آراستہ ڈر بند دروازہ لگنے لگا۔ شرم و حیا لباس کے مانند ہوتے ہیں۔ جب اتار کر پھینک ہی دیا تو پھر عزت و غیرت کے اقدار بھی بے معنی ہو جاتے ہیں۔

ایک رات تو اس نے مجرے کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں رات بھر سو نہ پایا۔ ''مجرہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' میں نے خود سے پوچھا۔ ''ڈانس ہی تو ہے۔ فلموں میں بھی تو دیکھتے ہیں۔ ڈراموں کے بعد اَب شادیوں میں سب ہی ناچتے ہیں۔ یہ کیسا گناہ ہوا؟''۔ میرے نفس کو امید کی کرن نظر آئی تو اس نے بھرپور وار کیا۔ ''بس بہت ہو گئی۔'' میں نے مسمم ارادہ کر لیا۔ ''میں بھی مجرا دیکھنے جاؤں گا اور واپسی پر مشہور زمانہ پھجے کے پائے بھی ٹرائی کر لوں گا۔'' دل میں تہیہ کر لیا۔ بٹوہ بھی چیک کر لیا۔ گزارے کی رقم موجود تھی۔ اَب میں اپنے میز پر بیٹھ کر کچھ کام کرنے لگا اور بے چینی سے محسن کا انتظار۔ مجھے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَ اَشْهَدُ اَنَّ

مُحَمَّدَ رَسُوْلُ اللّٰہo''۔کی صدائیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔میں نے سر اٹھا کر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھا تو سڑک کے بیچوں بیچ ایک جنازہ جا رہا تھا۔کفن میں لپٹی ہچکولے کھاتی میت، لال آنکھوں کے پیچھے سے سسکتے لوگ اور بلند آواز میں پڑھے جانے والے شہادت کے کلمے نے میرے تو نفس کی جان ہی لے لی۔سب خیالات ہوا ہو گئے۔عصر کا وقت ہو گیا تھا۔میں استغفار پڑھتا ہاسٹل کی مسجد کی طرف بھاگا اور جھٹ سے وضو کر کے خالق حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہوا۔نماز سے فارغ ہو کر ہاسٹل وارڈن کے پاس گیا کہ میرا کمرہ بدل دے۔اس نے وجہ پوچھی تو میں نے بتا دی۔ مسکرا کر بولا''لوگ تو پیسے دے کر نشے لوٹتے ہیں، تیری تو مفت میں موج لگی ہے''۔ خیر اس کے پاس کوئی فارغ کمرہ تھا بھی نہیں۔

وقت گزرتا گیا اور جنازے کا خیال بھی ماضی میں تحلیل ہو گیا۔اَب محسن کے معرکے شیطانیت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ضمیر اور نفس کی اس جنگ میں میرا ضمیر پھر مات کھانے لگا۔

ہمارے معاشرے کا عجب المیہ ہے۔ہم نیکی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو کمزور اور برائی بیان کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ہر کوئی بِکنے کو پھرتا ہے بس قیمت صحیح لگنی چاہیے۔رشوت، پرچیاں، واسطے، تعارفی کارڈ، رابطے بس یہی کنجیاں ہیں جو ہر دروازہ کھول دیتی ہیں۔شرافت گالی بن گئی ہے اور قناعت کو آگے نہ بڑھنے کے حوصلے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔عبادت کے ٹھیکیدار پیدا ہو گئے ہیں اور سیاست کی

منڈی میں سب بکتا ہے۔ اَب گناہ کھوجنا نہیں پڑتا۔ شعر و ادب ہو یا Entertainment Industry سب میں روحانیت کا فقدان اور حیوانیت کا چرچا ہے۔قوم کے پاس کوئی اور موضوع رہا ہی نہیں۔Internet پر عریاں فلموں کی سب سے زیادہ دیکھنے والی ہماری قوم ہے۔آنکھوں سے حیا اس قدر ناپید ہوگئی ہے کہ لوگ گھر والوں کے ساتھ باہر نکلنے سے گھبراتے ہیں۔نہ تربیت، نہ تحقیق، نہ مستقبل کے Role Models، نہ تاریخ کا علم، نہ کھیل کے میدان، نہ صحت مند تفریح اور نہ ہی روزگار کے مواقع۔اس پر دن بدن بڑھتا توقعات اور ذمہ داریوں کا بوجھ، گھر کے حالات، رشتہ داروں کے طعنے اور ان سب میں گھرا میرا نوجوان۔کیا کرے۔نشہ کرے تو برا، مے نوشی کرے تو کافر اور زنا کرے تو جہنمی۔ بہت سے اس پل صراط سے گزر بھی جاتے ہیں لیکن کچھ لڑکھڑا جاتے ہیں، سنبھل نہیں پاتے اور نامعلوم اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہر شے کی منڈی لگی ہے۔کون کتنے میں بکتا ہے یہ اس کا ظرف ہے۔خیر ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ہمیں تو اپنا قصہ سنانا ہے۔

محسن اور مجھ میں دوستی ہوگئی۔اس کے ساتھ جانے کی ہمت تو نہ ہوئی لیکن اس کے قصوں سے سکون آنے لگا۔وقت گزرتا گیا اور گناہ کی لذت کا فتور طاقتور ہوتا گیا۔ بالآخر ایک بار پھر اپنی مردانگی کی تشہیر کے لیے میں نے ہیرا منڈی جانے کا فیصلہ کر لیا۔خود کو سمجھایا کہ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔اور اگر محسن جیسے لوگ کلمہ پڑھ کر جنت میں چلے جائیں گے تو ہم بھی رحم کی امید رکھ سکتے ہیں۔ میں بنک گیا اور ذرا زیادہ روپے نکلوالایا۔واپسی پر نئے عطر کی شیشی بھی خریدی اور اس بار قلعہ فتح کرنے

کی نیت لیے اپنے کمرے میں آن بیٹھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور کبھی کبھی رکشہ کی آواز سے تھرا اٹھتی تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ پھر شہادت کے کلمے کی صدا میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے سر نہیں اٹھایا۔ مجھے نہیں دیکھنا تھا۔ میں سر جھکا کر اٹھا اور کھڑکی بند کر دی۔ کچھ دیر اللہ کی واحدانیت اور نبی پاکؐ کی پیغمبری کی ندا سنائی دیتی رہی، پھر مدھم ہوئی اور آخر گم ہوگئی۔ میں اَب بے صبری سے محسن کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ مغرب ہوئی اور پھر عشا۔ دس بج گئے لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، پھر گیارہ بج گئے تو میرا فتور نیند میں بدلنے لگا۔ میں محسن سے بہت ناراض تھا۔ لیکن میں نے امید نہ چھوڑی اور ٹکٹکی باندھے کمرے کے بند دروازے سے اپنے لطفِ حیات کے داعی کی راہ تکتا رہا۔ دروازے پر پہلے ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر بے ہنگم ہوگئی۔ میں بیزار ہو کر اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ کوئی ادھ موا انسان میرے ہاتھوں میں ڈھیر ہوگیا۔ ''محسن کیا ہوا''، ''محسن''۔ وہ زندہ تھا اور پتھرائی آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہا تھا لیکن بول نہ پاتا تھا۔ میں نے مدد کے لیے دوسرے لڑکوں کو آواز دی اور ہم اسے رکشے میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے اس کا علاج شروع کیا اور کوئی تین گھنٹے بعد نوید دی کہ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ میں اندر گیا اور اس کی حالت کی بابت دریافت کیا۔ کہنے لگا کہ ایک کنجری نے مردانگی کا طعنہ دیا تو صاحب نے جوش میں آ کر کوئی ٹیکا لگوا لیا جو لڑ گیا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ صحتمند ہونے کے بعد اس کنجری کو سبق سکھائے گا۔ میں نے سوچا کہ چلو وہ تو کنجری تھی، اس انسان کو کیا کہیں گے جو

موت کی وادی سے لوٹ کر پھر گناہ کی دلدل سے نہ نکل پا رہا تھا۔ صبح اس کے گھر والے آئے اور اسے اپنے خاندانی معالج کے پاس لے گئے۔ کسی کا طعنہ محسن کو لے ڈوبا اور اس کے انجام نے مجھے ہیرا منڈی کے فتنہ سے آزاد کر دیا۔ میرا تو وہ محسن ہی ٹھہرا۔ کچھ دنوں بعد خبر آئی کہ محسن جانبر نہ ہو سکا اور خالق حقیقی سے جا ملا۔ بہت دکھ ہوا۔ اس کے جنازے میں شرکت کے لیے اس کے شہر پہنچا۔ کچھ دیر ہو گئی اس لیے اس کے گھر جانے کی بجائے قبرستان سے کچھ پہلے جنازے کا انتظار کرنے لگا۔ یکلخت شہادت کے کلمے کی صدائیں میری سماعت سے ٹکرائیں اور قریب آتی گئیں۔ کفن میں لپٹی بے بس میت چارپائی کے ہچکولوں کے ساتھ ہچکولے کھا رہی تھی۔ سرخ آنکھوں کے پیچھے سے سسکیاں لیتے لوگ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ منظر تو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ شاید تمام جنازے ایک جیسے ہی ہوتے ہوں گے۔ تدفین اور رسومات سے فارغ ہو کر واپس ہاسٹل پہنچا۔ اس بار وارڈن نے کمرہ بدلنے کی درخواست جھٹ سے مان لی۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے جیسا ہی تھا۔ وہی کھڑکی، وہی سڑک وہی میں، لیکن کچھ تو بدل گیا تھا۔ ہاسٹل کے سامنے کوئی بیس برس سے پان والے چاچا کی ایک دکان تھی جس کی بنٹے والی بوتل بہت مشہور تھی۔ ایک شام دکان پر گیا۔ بوتل کے پیسے دیتے ہوئے نجانے کیا خیال آیا کہ دکاندار سے پوچھا، ''چاچا۔ بہت دنوں سے یہاں سے کوئی جنازہ نہیں گزرا۔'' اس نے کمال حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا، ''بیٹا جی یہاں سے تو کبھی کوئی جنازہ نہیں گزرا۔''